سبق ۔ 22

غزل

غزل کے لفظی معنی محبوب سے گفتگو کے ہیں۔ اِسی تعلّق سے اپنے اِبتدائی دَور میں غزلوں میں زِیادہ تر عِشق و عاشقی کی باتیں، محبوب سے گِلے شِکوے، درد و غم کا بیان ہی ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ زِندگی کے تمام مسئلے شاعروں نے غزل میں بیان کرنے کی شُروعات کی اَور فلسفہ، نفسیات، تصوُّف سب کُچھ غزل میں آنے لگا۔ اُردو میں غزل کی اِبتدا فارسی غزل کے اثر سے ہی ہُوئی۔ اِس لیے شُروع میں اُردو غزل کے تمام مَوضوع بھی وُہی رہے جو فارسی کے تھے۔

غزل میں کم سے کم پانچ اشعار کا ہونا ضروری کہا گیا ہے۔ حالاں کہ کہیں کہیں تین اشعار کی غزل بھی مِلتی ہے۔ زِیادہ سے زِیادہ کِتنے اشعار غزل میں ہونے چاہییں اِس کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن اکثر اُستادوں کے یہاں گیارہ اَور اِکّیس اشعار کی غزلیں مِلتی ہیں۔

غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔ مطلع کے دونوں مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا لازم ہے۔ ہر شعر کے دو ٹکڑے ہوتے ہیں اور ٹکڑے یا لائن کو مصرع کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر:۔

ہستی اپنی حُباب کی سی ہے
یہ نُمائش سراب کی سی ہے

اس شعر میں 'ہستی اپنی حُباب کی سی ہے'، ایک مصرع ہے اور 'یہ نُمائش سراب کی سی ہے'، دوسرا مصرع ہے۔ پہلے مصرعے کا لفظ حُباب اور دوسرے مصرعے کا سراب دونوں قافیے اور اُس کے بعد کا لفظ ردیف ہے۔

غزل میں ایک سے زیادہ مطلعے بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر شعر کے دوسرے مصرعے کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔

غزل کا آخری شعر مقطع کہلاتا ہے۔ مقطع میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر:۔

داغؔ کو کون دینے والا تھا
جو دیا، اے خدا! دیا تو نے

یہ نواب مرزا خاں داغؔ دہلوی کی غزل کا مقطع ہے اس میں شاعر نے اپنے تخلص داغؔ کا استعمال کیا ہے۔ غزل کے لیے مقطع کا ہونا لازمی نہیں لیکن مطلع کا ہونا لازمی ہے۔

غزل میں کوئی ایک خیال یا موضوع نہ ہو کر الگ الگ اشعار میں الگ الگ خیال یا تصوّر پیش کیا جاتا ہے۔ بعض شاعروں نے ایک خیال یا

ایک تصوّر ہی غزل میں اِستعمال کیا ہے۔ ایسی غزل کو مُسلسل غزل کہتے ہیں۔ عام طور پر غزل کا ہر شِعر جُداگانہ ہوتا ہے ۔ وُہ معنی کے لیے غزل کے دوُسرے شِعر پر اِنحصار نہیں کرتا۔ غزل کے ہر شِعر میں معنی کی الگ دُنیا مِلتی ہے۔

غزل کی دُنیا میں میرؔ، دردؔ، آتشؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، داغؔ، اکبرؔ، اصغرؔ، جگرؔ، مجازؔ، فراقؔ، فیضؔ وغیرہ بہت مشہوُر اور مقبول نام ہیں جن کی بدَولت اُردوُ غزل نے ترقّی کی منزلیں طے کیں اور آج غزل فن اور مقبوُلیت کی معراج پر پہنچ گئی ہے۔ نموُنے کے طور پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کِدھر جائیں گے

(ذوقؔ)

پُرانی روشنی میں اور نئی میں فرق ہے اِتنا
اُسے کشتی نہیں مِلتی اِسے ساحِل نہیں مِلتا

(اکبرؔ الہ آبادی)

تُم مِرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوُسرا نہیں ہوتا

(مومنؔ)

ایک مُدّت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں

اَور ہم بھوُل گئے ہوں تُجھے اَیسا بھی نہیں

(فراقؔ گورکھپوری)

رنجِش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لِیے آ

آپھِر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لِیے آ

(احمد فرازؔ)